محمد حنیف ندوی

دائرۂ اجتہاد کی وسعتیں

اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ کارگاہِ حیات، یہ عالم رنگ و بُو اور یہ چمنستانِ دہر سراسر اللہ تعالےٰ کے علم و تدبیر کا نتیجہ اور اس کی خلاقیوں کا رہینِ منت ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس کی تخلیق و آفرینش کے پہلو بہ پہلو انسانی ذوق و بصیرت کی نادرہ کاریاں نہ ہوتیں یعنی انسان اگر فطرت کے سادہ خاکوں میں رنگ نہ بھرتا اور اس کی تکمیل و ترقی میں جانفشانی و ہنرمندی کا ثبوت نہ دیتا تو آج تہذیب و تمدّن کی جو گہما گہمی اور رونق دکھائی دے رہی ہے اس کا وجود تک نہ ہوتا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ قدرت و فطرت اگر اشیاء کو خلعتِ وجود بخشتی اور پیدا کرتی ہے تو حضرتِ انسان کی خدمات بھی کم اہم نہیں۔ یہ ان اشیاء سے حیرت انگیز کام لیتا ہے۔ انہیں سنوارتا اور چمکاتا ہے، نظم و ترتیب کی رنگا رنگی سے عجیب و غریب صورتیں پیدا کرتا ہے اور یہی دو گونہ کوششیں اور فطرت و انسان کی سازگاریاں ہیں جن سے بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدّن معرضِ ظہور میں آئے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم کہیں کہ گیسوئے قدرت کبھی انسانی ذوقِ جمال و آرائش کی منت پذیریوں سے آزاد نہیں ہوا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ مذہب بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ یہاں بھی فیضانِ وحیٔ الہام کے ساتھ ساتھ انسان کی تعبیر و ترجمانی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ویدوں کو اگر اپنشدوں کے مصنّفین تصوف و فلسفہ کے سانچوں میں نہ ڈھالتے، یہودیت کو اگر فلو ایسا حکیم و دانشور میسّر نہ آتا اور عیسائیت کو ایکونیاس اور آگسٹن ایسے حکماء اگر معقول رنگ میں پیش نہ کرتے تو ان مذاہب میں کوئی کشش اور جاذبیت نہ پائی جاتی اور استفادہ و ایمان کا وسیع حلقہ صرف چند نفوس ہی تک سمٹ کر رہ جاتا۔ خود اسلام کے بارے میں ہمارا یہی عقیدہ ہے۔ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اس کو صرف وحی و الہام اور الفاظ و نصوص کی حد تک محدود سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس میں ذوقِ نبوّت کی جمال آرائیوں کو بھی دخل ہے اور آں حضرتؐ کے اپنے اجتہاد و بصیرت کا بھی حصّہ ہے۔ یہی نہیں، نقطۂ نظر اس سے بھی وسعت و کشائش کا طالب ہے۔

آنحضرتؐ کا اجتہاد اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و سنّت کے گل و ریحان کی چمن بندی میں کس کس کا ہاتھ ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ فقہاءِ عظام کی موشگافیوں نے اس کے جملہ اطلاقات کو ایک نظامِ عمل کی شکل میں مدوّن کیا، متکلّمین اسلام اور حکماء نے اس کے عقلی و فکری مقام کی وضاحت کی۔ اور صوفیاء و شعراء نے اس کے حکیمانہ لطائف کو اُجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور ان سب کی یہ کوششیں اسلام کی بہترین میراث اور نہایت ہی قیمتی ذخیرہ ہیں۔ جن سے ایک

لمحہ کے لئے بھی بے نیازی اختیار نہیں کی جاسکتی۔

غرض یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کی تشریح و فہم کے پیمانوں کا تعلق ہے اور جہاں تک نفس اجتہاد و بصیرت کی کارفرمائیوں کا سوال ہے، ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی وہی حیثیت ہے جو حکومت کے عام مظاہر سے متعلق انسانی عقل و دانش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم جب مسئلہ اجتہاد پر بحث کرتے ہیں تو اس کو اسلام سے الگ کوئی بیرونی و اجنبی چیز نہیں سمجھتے، بلکہ اس کو اسلام ہی کا ایک داخلی اور ضروری تقاضا خیال کرتے ہیں اور اس کا آغاز ائمہ مجتہدین کے بجائے آں حضرتؐ سے کرتے ہیں۔ اجتہاد نے وحی و الہام کے پہلو بہ پہلو دین کی تشکیل میں حصّہ لیا ہے اور قرآن کے ساتھ ساتھ آں حضرتؐ کے مجتہدات نے بھی بہت سی مشکلات کو سلجھایا ہے۔ یہ ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید کے لئے ہمیں عہدِ نبوی کے چند مظاہر کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے قرآن کی ترتیبِ سورہ کا مسئلہ ہی لیجئے کہ اس باب میں کوئی نص موجود نہیں لیکن آں حضرتؐ نے اس کے باوجود محض اپنے ذوقِ اجتہاد کے بل پر اس میں ترتیب و نظام قائم رکھنے کی تلقین فرمائی۔ جب نمازیں فرض قرار پائیں تو سوال یہ تھا کہ قبلہ کونسا ہو؟ آں حضرتؐ صلعم نے فیصلہ کیا کہ بیت المقدس کو سردست مرکزِ توجہ ٹھہرالیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سولہ سترہ ماہ تک مسلمان اُدھر رُخ کرکے نمازیں پڑھتے رہے۔ پھر جب کعبہ کو اس کے بجائے قبلہ مقرر کیا گیا تو اس کے لئے بھی طلب و آرزو کے داعیے آنحضرتؐ کے قلبِ اقدس ہی میں اُبھرے۔

قد نریٰ تقلّب وجھك فی السماء (الآیہ) اس آیت میں قبلۃ ترضٰھا کے الفاظ خصوصیت قابلِ لحاظ ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرتؐ کی رضا بھی مطلوبِ دین ہے۔ مگر یہ رضا کیا ہے؟ کیا آنحضرتؐ کی کوئی نفسی خواہش؟ کوئی دنیوی یا مادی آرزو اور طلب؟ نہیں۔ ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ "رضا" جس کو اللہ تعالیٰ نے اس درجہ درخورِ اعتنا سمجھا ہے، اجتہاد و بصیرتِ نبویؐ کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

یہی نہیں، پورا دین نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور معاشری زندگی کا وہ تفصیلی نقشہ جو قرآن میں موجود نہیں ہے آں حضرتؐ کا اجتہاد ہی تو ہے جس نے اس وجہ سے شریعت کی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ آں حضرتؐ کے مجتہدات تشریعی کو ماننے کے ہم بہرحال مکلّف ہیں۔ اس لئے مکلّف ہیں کہ ان مجتہدات میں اگرچہ سہو و غلطی کا اسی طرح امکان پایا جاتا ہے جس طرح کہ عام مجتہدین کے نتائج فقہی میں۔ مگر وحی و الہام کی نگرانی چونکہ اس سہو و غلطی کو قائم نہیں رہنے دیتی اور عنایت الٰہی و فیضانِ ربوبیت چونکہ آں حضرتؐ کے فہم و فکر کی استواریوں کا بہترین اور کامیاب ضامن و کفیل ہے، اس لئے ضروری ہے کہ آپ کا اجتہاد محض ایک مجتہد اور فقیہ کا اجتہاد نہ رہے بلکہ شریعت و دین کا ایک تقاضا اور جزو ہو اور اس لائق ہو کہ اس کو مانا جائے اور تسلیم کیا جائے۔

نبوّت کے ساتھ ساتھ آں حضرتؐ کی مجتہدانہ حیثیت بھی برقرار رہتی ہے۔ یا واضح تر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اجتہاد بھی دائرۂ نبوّت اور منصبِ نبوّت کا ایک ضروری حصّہ ہے۔ اس پر اصولیوں نے کھل کر بحث کی ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض، ابنِ خلدونؒ، ابن ہمام اور قرافی کی تصریحات اس باب میں شاہدِ عدل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مسئلہ زیر بحث کی اس تصریح سے ہمیں دو باتوں کی طرف خصوصیت سے اشارہ کرنا مقصود ہے ایک یہ کہ اجتہاد چونکہ ایک جانا بوجھا اسلامی تقاضا ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کی اجازت ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ اس کے دروازے کسی دَور میں بھی اُمت پر بند رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے وحی و الہام کے یہ معنی قطعی انسب نہیں کہ فکر و اجتہاد کی تگ و تاز پر پابندیاں عاید کردی گئی ہیں۔ یا یہ کہ علم و ادراک کے ان دو سرچشموں میں کوئی حقیقی منافات پائی جاتی ہے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہم یہ کہیں گے کہ ہمارے نزدیک جس طرح ایک اچھا اور کامیاب سیاسی نظام وہ ہے جسمیں ہر کوئی شریک ہو، جس میں کسی فریق یا گروہ کی اجارہ داری تسلیم نہ کی گئی ہو اور جو اس لائق ہو کہ ہمیشہ فکر و عقل تجربات کی روشنی میں اس میں مناسب رد و بدل کرسکیں۔ ٹھیک اسی طرح صحیح، قابلِ عمل اور ترقی پذیر مذہب وہی ہوسکتا ہے جسمیں بنیادی اور اساسی تعلیمات کے سوا عملی جزئیات اور معاشرتی فروع میں، اہلِ علم اور دانشوروں کو تشریح و ترجمانی کی پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ تاکہ نہ تو معاشرہ کی تیز رفتاریوں میں فرق آئے اور نہ ایسا ہو کہ مذہب و دین و رہنمائی کا فریضہ انجام دینے سے قاصر رہے۔ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کم از کم اس معیار پر پورا اُترتا ہے۔

دو بنیادی نکات

مسئلہ اجتہاد کے سلسلے میں دراصل قابلِ غور دو نکتے ہیں:

اوّلاً اجتہاد و استنباطِ مسائل کے شرائط کیا ہیں؟

ثانیاً۔ کیا اس کے حدود بنیادی تبدیلیوں تک وسیع مانے جاسکتے ہیں۔ ہم اپنے افکار کو انہیں دو نکتوں تک محدود رکھیں گے۔

جہاں تک شرائطِ اجتہاد کا تعلق ہے اس پر دو پہلوؤں سے گفتگو ہوسکتی ہے۔ ایک یہ کہ منصبِ اجتہاد کن کن علمی و عملی خوبیوں کا متقاضی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر حکومت و تقنین کے دائرے الگ الگ نہ ہوں اور ایک ہی ادارہ ایسا پایا جائے جو برسرِ اقتدار بھی ہو اور یہ بھی چاہتا ہو کہ قانون کو اسلامی سانچوں میں ڈھالا جائے۔ تو اس صورت میں اجتہاد و قیاس کی مشینری کو کیونکر بروئے کار لایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں پہلو بالکل مختلف ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں ملوکیت و شخصی حکومتوں کا دور دورہ رہا۔ اور مذہب و سلطنت دو الگ الگ خانوں میں منقسم رہے، اس وقت تک قضاء و افتاء کے دائرے بھی جُدا جُدا رہے۔ اس لئے ہمارے ہاں اگر اصولیوں نے اس کے استحقاق کے بارے میں زیادہ احتیاط کا ثبوت دیا اور کڑی اور سخت شرطیں پیش کیں تو یہ بالکل قدرتی بات تھی۔ مگر اب حالات کا نقشہ پلٹ چکا ہے۔ پاکستان نے ایک اسلامی جمہوریہ کی شکل میں اپنے کو پیش کیا ہے۔ اور اس کے نظامِ آئین میں یہ داخل ہے کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں یہ تقنین و آئین سازی کی طرف قدم بڑھائے۔ اس صورت میں اب یہ فرض صرف ایک یا دو چار گنے چُنے مجتہدین کا نہیں رہتا کہ تنہا وہی اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہوں۔ بلکہ اس ذمہ داری میں بحالاتِ موجودہ پاکستان کا ہر وہ شہری شریک سمجھا جائے گا جو فقہ و قانون کی نزاکتوں کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ زمانہ کے مقتضیات کیا ہیں؟ یعنی اب قانون پر غور و فکر بہرحال اجتماعی سطح ہی پر ہوگا، کسی ایک

فقیہ یا مجتہد پر اس بارے میں اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت گو ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس مشینری کی تفصیلی وضاحت کریں جو اسلامی قانون کو معرضِ ظہور میں لاسکتی ہے۔ تاہم اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ صورتِ حالات کی اس تبدیلی سے شرائطِ اجتہاد کی تقنین و وضاحت کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہا جتنا یہ مسئلہ کہ کسی رائے کو قانون بننے تک کن کن اجتماعی و جمہوری مراحل سے گذرنا چاہئے۔ اس کا صاف صاف یہ مطلب ہے کہ تصفیہ مسائل کے عمل نے اب قطعی دوسری صورت اختیار کرلی ہے۔ لیکن ہمیں تعجب ہے کہ کلوکیم میں حصہ لینے والے بعض حضرات نے شرائطِ اجتہاد پر اس انداز میں غور کیا ہے گویا اب بھی ماموں اور ہارون رشید کا زمانہ ہے اور اس عرصہ میں قضا و افتاء کے خانوں میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ حالانکہ قبائے ملوکیت کی دھجیاں صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بکھریں بلکہ ساری دنیا میں بکھری ہیں اور اگر کہیں کہیں یہ باقی ہے تو بس چند ہی دنوں کی مہمان سمجھئے۔

بدلتا ہوا معاشرہ دوسرا نکتہ درحقیقت اس درجہ اہم تھا کہ اس پر خصوصیت سے غور ہونا چاہئے تھا۔ مگر اسے سہل انگاری کہئے یا روزمرہ کے مسائل سے پہلوتہی کہ مسئلہ اجتہاد کے سلسلہ میں اس موضوع کو چھیڑا نہیں گیا۔ سوال یہ ہے کہ اجتہاد و استنباط کے حدود میں صرف چند فقہی انداز کے غیر ضروری فروع ہی آتے ہیں۔ یا معاشرہ میں جو بنیادی اور اساسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے بحث و تعرض بھی اس کے دائرہ اختیار میں داخل ہے۔ اکثر حضرات نے بر بنائے مصلحت نصوص سے متعلق معقول روش اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ اجتہاد و فکر کی تگ و تاز صرف انہیں مسائل تک محدود رہے گی جو کتاب و سنت میں مذکور نہیں ہیں اور وہ جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی تصریحات پائی جاتی ہیں۔ ان سے متعلق کوئی مسلمان غور و فکر کا مجاز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر مجمل ہے اور اس سے زندگی کے موجودہ مسائل کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ خود اجتہاد کے حدود و استناد کا تعلق نفسِ اجتہاد سے ہے جس میں بہرحال دو رائے ہوسکتی ہیں۔ اس بنا پر یہ کیونکر جائز ہوگا کہ صرف ایک ہی پہلو کی صحت پر اصرار کیا جائے۔

مزید برآں تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ موقف صحیح نہیں۔ حضرت عمر نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا، یا اراضی سوادِ کی تقسیم کو جن عمومی مصالح کے پیش نظر روکا، اس سے کسی طریق سے بھی اس زاویۂ نظر کی تائید کا سامان بہم نہیں پہنچ پاتا۔ آج کون غلامی کی کھلے بندوں مذمت نہیں کرتا اور یہ نہیں کہتا کہ اسلام اس کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا مگر کیا اس تاویل کا ثبوت اس صدی سے پہلے کے اسلامی لٹریچر سے پیش کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہمارے ہاں احادیث و فقہ کے دفاتر اس مسئلہ کے متعلقات سے بھرے پڑے ہیں اور ہماری تہذیب و تمدن میں اس کو ایک ایسے عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے، کہ آج سے پہلے یہ بات حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ ایک دور ایسا بھی آسکتا ہے جب نہ صرف غلامی کو ناجائز کہا جائے گا بلکہ اس سے متعلقہ تمام نصوص و تصریحات کو غیر ضروری قرار دے دیا جائے گا۔ کیا غلامی کے بارے میں اس موقف سے نصوص متاثر نہیں ہوئیں اور مسائل و تفریعات اور فقہ و حدیث کے ابواب کے ابواب غیر ضروری نہیں ہوگئے۔ ٹھیک اسی طرح آج کنبہ و عائلہ کے مفہوم میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اسی تبدیلی کی بنا پر آج سے برسوں پہلے علامہ اقبال مرحوم نے فرائض

و میراث کی نئی تشریح کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جو لوگ میراث و فرائض کے مسائل سے ذرا بھی شغف رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں فروع و اصول اور اطراف و جوانب کا یہ پھیلاؤ یا تقسیم کی پیچیدگیاں محض اس بناء پر اختیار کی گئی تھیں، کہ اسلام جب نازل ہوا ہے اس وقت کنبہ و عائلہ میں وہ تمام افراد شامل تھے جو اس کی حفاظت کرتے تھے جو اس کے لئے دشمنوں سے لڑتے اور جد و جہد کرتے تھے اور بہت سے قریب یا دور کا نسبی تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایسی مناسبتیں تھیں کہ ایک معقول اور الہامی مذہب کے لئے جن کی رعایت رکھنا ضروری تھا۔ اس وقت صورتِ حالات دوسری ہے۔ اب کنبہ میں وہ پہلا سا پھیلاؤ نہیں رہا ہے اور انفرادیت نے اس کو میاں بیوی اور اولاد تک محصور کر کے رکھ دیا ہے۔ نیز عورت کی معاشی، معاشرتی اور ذہنی ترقی نے بھی استحقاق کے نئے گوشے پیدا کر دیئے ہیں۔ اس بنا پر علامہ کی سفارش نہایت ہی توجہ طلب اور معنی خیز ہے۔

عصرِ حاضر کی خواتین اور فقہا

سب سے بڑی تبدیلی جس نے ہمارے معاشرہ کو متاثر کیا ہے اور جس کی بناء پر متعلقہ مسائل کا پورا نقشہ ہی بدل جاتا ہے، وہ موجودہ دور میں عورتوں کی جد و جہد اور فکری و معاشرتی درجہ و مقام کی تبدیلی ہے۔ عموماً تمام مذاہب نے اس کے بارے میں احکام و مسائل کا جو انداز تجویز کیا، وہ اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ اللہ کی یہ مخلوق نسبتہً کمزور ہے عقل و دانش اور تعلیم و تربیت میں پسماندہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ معاشی طور پر خود مختار نہیں اور اس لائق نہیں کہ عزت و آبرو سے معاشرہ کی دولت میں ذرا بھی اضافہ کر سکے۔ ان حالات میں بلاشبہ یہ دوسرے درجہ کی مراعات کی مستحق قرار پاتی ہے اور ہرگز اس لائق نہیں ٹھہرتی کہ زندگی کی تگ و دو میں اصالۃ حصہ لے سکے اور تاریخ کے صفحات میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کی مہریں ثبت کر سکے۔ مگر پچھلی ڈیڑھ دو صدی کی تعلیمی و تربیتی جد و جہد نے اس کے ذہنی افق کو خاصہ روشن کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کی ذہنی و فکری سطح بہت بلند ہو گئی ہے اب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اپنے کانوں سے دنیا کی پکار اور تقاضوں کو سننا چاہتی ہے اور خاوند یا کسی ذی محرم کی وساطت و نیابت کی قائل نہیں رہی۔ اس طرح صورتِ حالات میں ایک اصولی اور بنیادی تغیر رونما ہوا ہے کہ پہلے اس کی حیثیت اگر الگ ایسی شے کی تھی جس کے بارے میں غور و فکر کے گوشے تحریک میں آتے تھے تو اب یہ اس غور و فکر میں خود برابر کی شریک اور رہبر ہے۔ پھر معاشی اعتبار سے بھی بڑی حد تک خود مختار ہوتی جا رہی ہے۔ اور اشتراکی ممالک میں تو سیاسیات کے دروبست پر بھی اس کا قبضہ ہے۔

علاوہ ازیں موجودہ طریقِ جنگ نے ضروری قرار دیا ہے کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ اور پہلو بہ پہلو زندگی کی معرکہ آرائیوں میں حالتِ امن میں کام کریں۔ ان حالات میں فقہائے اُمت سے بجا سوال یہ ہے کہ کس منطق سے اور کس طریقِ استدلال سے ان عورتوں کو ثانوی درجے کے احکام و مسائل پر مطمئن رکھا جا سکتا ہے۔ یہ اور اس نوع کی اور کئی تبدیلیاں ہیں جو ہمارے گرد و پیش رونما ہو رہی ہیں اور بالکل ہی نئی اور جرأت مندانہ تشریح و ترجمانی کی طالب ہیں۔ لہٰذا کیا ان سے نمٹنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اجتہاد کے دائروں کو وسیع کیا جائے اور مصرح اور غیر مصرح کی قید اُٹھا دی جائے اور دیکھا صرف یہ جائے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کی روشنی میں ان مسائل کو کیونکر حل کرنا ممکن ہے۔ یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ زمانہ کا منتظر علماء کرام کے فتویٰ کا انتظار نہیں کریگا۔ نئی تبدیلیاں، نئی فقہ اور نئے قانون کی تدوین بہرحال کر کے رہیں گی۔ (امروز)